ڈاکٹر اے۔بی۔اشرف کا تنقیدی شعور

☆ ڈاکٹر محمد امجد عابد
شعبہ اُردو، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لاہور

Abstract:

"Contemporary Conciousness" is such a feeling that occures because of social changes on the mind and heart of a creator and indirectly comes under the discussion of a critic. Dr. A.B. Ashraf is a renowned researcher and critic. Being a critic he has also had a deep relation with society. He, in his criticism, has given the proof of contemporary awareness in the light of contemporary situation along with social awareness. He puts a critical eye on social life of his age. In this essay given, his use of contemporary conciousness is indicated.

یہ زندگی ہی ہے جو قدرت کی تخلیقات سے لے کر فرد کی ذات میں موجود اوصاف سے تعمیر پاتی ہے۔ انسان کے ذہنی دھارے نے فطرت کی رنگا رنگی سے اکتساب کیا ہے۔ زندگی کو سنوارنے کے لیے فرد نے اپنی صلاحیتوں سے جو شعوری کوشش کی ہے اس سے زندگی اور بھی نکھر کر سامنے آئی ہے۔ یہی رجحان جب کسی تخلیق کار کے ہاں نشو ونما پاتا ہے تو اس کے تخلیقی رجحان اور تنقیدی رویے کے باہمی ملاپ سے نئی جہتوں کی طرف رہنمائی ملتی ہے۔ یوں تخلیق کار کے اندر تنقیدی جوہر پوری توانائی سے ابھرتا اور زندگی کے باطن میں جھانک کر اس کے ارتقا میں مدد دیتا ہے۔ موجودہ عہد تک پہنچتے پہنچتے ہمارے تخلیق کاروں اور نقادوں کے ہاں عصری شعور کی اتنی جہتیں نمایاں ہو کر سامنے آ چکی ہیں کہ ہمارے ادب میں ان کو بڑی اہمیت حاصل ہو چکی ہے۔ یوں ان کی تنقیدات کے شعور کی روشنی چہار سو پھیل رہی ہے جو معاشرے میں نئی اقدار کے فروغ اور صحت مند نظریات کے آگے بڑھنے میں مدد دے رہی ہے۔ ان نقادوں میں ڈاکٹر اے۔بی۔اشرف (احمد بختیار اشرف) کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اُن میں اہم تنقیدی تصانیف میں ''آغا حشر اور اُن کا فن''، ''ادب اور سماجی عمل''، ''کچھ نئے اور پرانے شاعر''، ''کچھ نئے اور پرانے افسانہ نگار''، ''مسائل ادب۔تنقید و تجزیہ''، ''حکیم احمد شجاع اور اُن کا فن'' اور ''شاعروں اور افسانہ نگاروں کا مطالعہ'' شامل ہیں۔ ان کے ہاں تنقید کا مقصد ہی یہ ہے کہ ایسا ادب تخلیق کیا جائے جو معاشرے کو ہر اعتبار سے توانا بننے میں مدد دے۔ ان کی تنقید ادب پارے کو اس انداز سے پرکھتی ہے کہ اس میں موجود ان عناصر کی نشاندہی ہوتی ہے جو زندگی کے ارتقا میں رکاوٹ ڈالتے ہیں۔ وہ زندگی کے حقائق سے باخبری کو تخلیقی قوت کا رہنما

قرار دیتے ہیں۔ یوں دیکھا جائے تو اے۔ بی۔ اشرف ادب میں مقصدیت کے عنصر کو بڑی توجہ کا حامل گردانتے ہیں۔ ڈاکٹر عرش صدیقی لکھتے ہیں:

''اے۔ بی۔ اشرف تمام انسانی رویوں کو معاشرتی صورت حال اور انسانی صورتحال کے پس منظر میں دیکھتے ہیں اور یہی ان کی تنقید کی بنیاد ہے۔ وہ اسے فنکار کے فرائض میں شامل سمجھتے ہیں کہ فنکار معاشرتی انصاف کے مقصد کو ہمیشہ پیش نظر رکھے اور اپنے ہر عمل کو با مقصد بنائے۔ وہ بجا طور پر یہ بھی لکھتے ہیں کہ انسان کی مادی زندگی کو بہتر بنائے بغیر اس سے روحانی عظمتوں کی توقع غلط ہے۔ مادی زندگی میں انصاف، اخوت، ایمان داری اور خوش اخلاقی کی اقدار استوار ہوں گی تو روحانی زندگی از خود اعلیٰ ہو جائے گی۔'' ۱

دیکھا جائے تو جس فنکار کے ہاں تخلیقی عمل با مقصد ہو گا وہ معاشرے کے ارتقا میں معاشرتی انصاف اور معاشرتی اقدار کو پوری طرح سے جلوہ گر دیکھے گا اور عدل و انصاف، قانون کی بالا دستی، اخلاقیات اور ایمانیات کی پوری کارفرمائی کو اپنی تخلیقات اور تنقیدات میں سموئے گا۔ ڈاکٹر اے۔ بی۔ اشرف کے ہاں اس پہلو کی پیش کش ہمیں ان کی تنقیدات میں جا بجا جلوہ گر دکھائی دیتی ہے۔ عرش صدیقی نے ان کی طرف توجہ دلا کر ان کے تنقیدی رویوں کی طرف سمت نمائی کی ہے۔

زندگی اور ادب کا آپس میں رشتہ جس قدر گہرا اور پہلو دار ہے اس کو اگر توجہ سے دیکھا جائے تو ہمیں دنیا بھر کے ادب میں زندگی اسکے مقاصد اور ان کی کارفرمائی سے زندگی کے چہرے پہ حسن کی آبداری بڑی نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ انفرادی جذبوں اور احساس کے تخلیقی اظہار سے ادب میں معاشرتی اور ذاتی شعور کی پیش کش سے کس طرح عصری شعور کا اظہار ہوتا ہے اس کو اگر غور سے سمجھنا ہو تو ہمیں ادبیات عالم میں کلاسیکی ادب کو دیکھنا پڑے گا کہ کس طرح ہر عہد میں تخلیق کاروں نے اپنے شعور، آگہی اور وجدان سے معاشرے میں فرد اور افراد کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ اسی باعث ہر دور کا ادب آنے والے دور کے ادب کا پیش رو ٹھہرتا ہے۔ ادب اور زندگی کے باہمی رشتے کی وضاحت کرتے ہوئے اے۔ بی۔ اشرف نے ادب اور انسانی زندگی کو آپس میں اس قدر مربوط بتایا ہے کہ ایک کے بغیر دوسرے کی زندگی کا تصور ہی ناممکن ہے۔ ان کے مطابق:

''زندگی ارتقا اور مسلسل ارتقا کا دوسرا نام ہے۔ جس میں انفرادی اور اجتماعی پہلو دونوں شانہ بشانہ چلتے ہیں۔ انفرادیت، اجتماعیت کے بغیر کوئی وجود نہیں رکھتی اور اجتماعیت، انفرادیت سے علیحدہ کوئی چیز نہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں اور دونوں کو ارتقائے حیات میں ایک دوسرے کا ممد و معاون ہونا چاہیے۔ اسی کا نام حیاتِ انسانی کا ارتقا ہے۔ ادب اسی حیاتِ انسانی کا عکاس اور ترجمان ہے۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ ادب زندگی کی مقتضیات میں سے ہے تو بے جا نہ ہو گا۔'' ۲

ادب اور زندگی کے باہمی رشتے کو سمجھنے کے باعث ہی تو ادب میں مختلف تحریکات جنم لیتی ہیں جن سے عصری آگہی کے پروان چڑھنے سے ہی مختلف ادوار میں تخلیقات اور تنقیدی و عصری آگہی سامنے آتی ہے۔ جو ہمیں یہ باور کرانے کے لیے کافی ہوتی ہے

کہ جو ادب سماجی عناصر کے تال میل سے لکھا جاتا ہے وہی زندہ بھی رہتا ہے اور معاشرے کی تعمیر و تشکیل میں اپنے حصے کا کردار بھی ادا کرتا ہے۔ اگر کسی تخلیق میں گرد و پیش کی زندگی پوری طرح سے نمایاں نہیں ہو سکی تو وہ تخلیق جلد یا بدیر اپنی موت آپ مر جائے گی۔ اس بات کو ہم جب تنقیدی شعور کے تناظر میں دیکھتے ہیں تو ہمیں اپنی تہذیبی اور سماجی زندگی پوری طرح سے ادب میں جلوہ گر دکھائی دیتی ہے۔ معاشرت کے جیتے جاگتے نقوش ادب کی متنوع تخلیقات میں جھلکتے نظر آتے ہیں۔ کچھ ناقدین کے نزدیک ادیب کو محض تخلیق حسن سے ہی دل بستگی کا سامان کرنا چاہیے اور اسے معاشرت، معاشرتی اقدار اور رویوں کی عکاسی کے عمل سے باز رہنا چاہیے۔ لیکن یہ درست نہیں ہے اور یہ طرزِ عمل ادب کی تخلیق کے لیے سم قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اے۔ بی۔ اشرف اس تناظر میں اپنے تنقیدی رویے سے درست صورت حال کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ادب کا کام تخلیق حسن کے ساتھ ساتھ زندگی کے حقائق کی عکاسی کرنا بھی ہے۔ ادب، زندگی، معاشرے اور تہذیب کا ترجمان و عکاس اور نقاد ہوتا ہے۔ یہ انسانی جذبات و احساسات اور بلند تر خیالات کا فنی اظہار ہے۔ اس میں سماجی اور افادی پہلو بھی ہونا چاہیے، فنی اور جمالیاتی بھی۔ اس کی یہ خصوصیت اسے زندگی سے ہم آہنگ کرتی ہے کیونکہ زندگی بھی انہی دو پہلوؤں سے عبارت ہے۔'' ۳

اے۔ بی۔ اشرف نے محض ادب برائے ادب کی تخلیق پہ زور دینے کی بجائے ادب میں مقصدیت اور افادیت کے پہلو کو بڑی جانکاہی سے پیش کیا ہے۔ ان کے نزدیک اگر ادب محض اپنی مسرت و لذت کے اظہار سے مملو ہے تو ایسا ادب زندگی کے حسن کو نکھارنے میں کوئی کردار ادا کرنے سے قاصر ہے۔ فنی اور جمالیاتی اظہار کے ساتھ ساتھ جب تک تخلیق کار اس میں اپنے عہد کے انسانوں کی ذات پہ لکھی جانے والی انسانی رویوں اور بے بسیوں کی صورتحال نہیں لکھتا، ادب اپنے حصے کا کردار ادا نہیں کر پاتا۔ معاشرتی شعور اور زندگی کے حقائق کا بھرپور اظہار ادب اور زندگی کے رشتے کو بڑی تابناکی سے سامنے لاتا ہے۔ اے۔ بی۔ اشرف کی تنقید کو اگر ایک اور انداز میں سمجھنے کی کوشش کی جائے تو اسے ہم زندگی کی از سر نو تخلیق کا نام بھی دے سکتے ہیں۔

ایک سوال یہ ہے کہ کیا ادب مقصد ہے یا مقصد کے حصول کے لیے ایک راستہ جس پہ چل کر زندگی کے مقاصد کو حاصل کیا جائے۔ اس کا جواب ہمارے ادیبوں اور نقادوں کے ہاں بڑی صراحت سے ملتا ہے۔ تخلیق کا دھارا انسانی سوچوں اور جذبوں سے عبارت ہے۔ انسان کیا چاہتا ہے اور اسے کس طرح سے عمل پذیر دیکھتا ہے اس کی جمالیاتی پیش کش ہی ادب ہے۔ تخلیق کار اپنی تخلیقات کے لیے بنیادی موضوعات زندگی ہی سے لیتا ہے۔ اس کا تخلیق کردہ ادب معاشرے کی عکاسی کرتا ہے۔ زندگی، اس کے احساسات اور معاملات کے تال میل سے آگے بڑھتی ہے۔ اس کے جذبے اور تمنائیں اس کے اندرون جب کہ خارجی ماحول اور عناصر اس پہ معاشرتی رویوں اور تقاضوں کا اظہار کرتی ہیں۔ یوں تخلیقی دھارا آگے بڑھتے ہوئے زندگی کی رنگارنگی کو سامنے لاتا ہے۔ اسے ہم ادب کے موضوعات کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر اے۔ بی۔ اشرف لکھتے ہیں:

> ''ادب کا آج تک کوئی موضوع متعین نہیں کیا جا سکا۔ اس لیے اس کا کوئی ایک موضوع ہے ہی

نہیں۔ادب کا موضوع زندگی ہے۔زندگی بڑی متنوع ہوتی ہے۔اس کے کئی پہلو ہیں معاشرتی، معاشی، سماجی، اخلاقی، تعلیمی، مذہبی۔غرض زندگی گوناگوں کیفیات کی حامل ہے اور زندگی کی یہی گوناگونی اور تنوع ادب کا موضوع ہے۔'' ۴

ادب اور تخلیقات میں یہ زندگی ہی تو ہے جو تخلیق کار کے نقطہ نظر سے پیش کی جاتی ہے۔شاعر اور تخلیق کار زندگی کے حسن وخوبی کے استعاروں کے پس منظر میں اپنے احساسات کو پیش کرتے ہیں اور اس کے آئینے میں جھانکنے سے ہمیں اس عہد کے ادبی اور جمالیاتی پہلوؤں سے آگہی ملتی ہے۔کہیں اس کے ہاں اخلاقی اقدار جھلکتے ہیں تو کہیں زندگی کے مسائل کی نشاندہی ہوتی ہے کہیں قدغنوں کے پس منظر میں زندگی کا جلال و جمال سامنے آتا ہے تو کہیں معاشرتی سیاست کے تار و پود سے زندگی نکھرتی، بکھرتی یا ٹوٹ ٹوٹ کر سنورتی نظر آتی ہے۔کہیں پند ونصائح، کہیں مقصدیت اور کہیں ادب اخلاقیات کے تقاضوں کو سامنے لانے کی سعی کرتا ہے۔یہ سب مسائل اور معاملات زندگی سے عبارت ہیں اور زندگی بذات خود اپنی مظہر آپ ہے۔یہ تخلیقات ہی ہیں جو سوچ کے راستوں کے تعین میں مدد دیتی ہیں۔جن تخلیق کاروں کے ہاں یہ اہم رجحان ان کی تخلیقات میں موجود دکھائی نہیں دیتا وہاں تخلیقات سے عصری تقاضے دم توڑتے دکھائی دیتے ہیں۔اے۔بی۔اشرف اسی حوالے سے ادب اور زندگی کے رشتے کی وضاحت پیش کرتے ہیں ان کے مطابق:

''ادب اور زندگی کا رشتہ دائمی ہے۔ادب کا سرچشمہ حیات ہے۔حیات ہی سے اس کے سوتے پھوٹے۔ادب پھول ہے تو زندگی اس کی مہکار۔ادب جسم ہے تو زندگی اس کی روح۔ادب دل ہے تو زندگی اس کی دھڑکن اور جس روز یہ دھڑکن بند ہوگئی ادب کی موت واقع ہو جائے گی۔'' ۵

ایک نقاد کی حیثیت سے ادب اور زندگی کے دائمی رشتے کی وضاحت کرتے ہوئے اے۔بی۔اشرف ادب اور زندگی کے ناگزیر تعلق کی جہتوں کو چند لفظوں میں سمیٹتے ہوئے گویا ادب اور زندگی کے تناظر کو پیش کر رہے ہیں اور ادب کو دل اور دھڑکن پھول اور خوشبو کے تلازمے سے سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔جو ہم پہ ادب کی زندگی میں اہمیت اور اس کے تقاضوں کی ماہیت سمجھاتی ہے۔اور حقیقت یہی ہے کہ انسانی زندگی انفرادی اور اجتماعی تناظر میں جبلت اور لاشعور کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑی جاسکتی۔اے۔بی۔اشرف کے مطابق شعور اور شعوری جدوجہد ہی ادب کی اہمیت اور افادیت کو اجاگر کرتے ہیں اور سماجی عمل جتنی خوبصورتی سے آگے بڑھتا ہے زندگی کی ترجمانی اتنی ہی رعنائی سے ہمارے ادب میں جلوہ گر ہونے لگتی ہے۔

اے۔بی۔اشرف نے جہاں ادب اور زندگی کے رشتے کو اپنی تنقید میں بخوبی پیش کیا ہے اسی طرح ادب کے سماجی عمل کی اہمیت کو بھی بڑی وضاحت سے پیش کیا ہے جو ایک طرف ان کے تاریخی شعور کا غماز ہے تو دوسری طرف مختلف ادوار سے گزرتے انسان اور اس کے تخلیق کردہ ادب کی صورت حال کا مطالعہ ہے۔جیسے جیسے ہمارا سماج بدلتا ہے ویسے ہی زندگی کی بنیادی اقدار بھی بدلتی ہیں اور زندگی جس قدر پہلودار ہوتی جاتی ہے ادب میں بھی اس کی عکاسی اسی انداز سے ہوتی جاتی ہے۔جب ادب نوابوں، جاگیرداروں اور بادشاہوں کے دور سے گزرتا ہے تو اس میں خوشامد، غلامانہ ذہنیت اور عیش پرستی کے رنگ دکھائی دیتے ہیں۔بالخصوص طویل بادشاہتوں کے ادوار میں تقدیر پرستی، بے عملی، شکست خوردگی، زندگی سے بے اعتنائی اور ذات سے فراریت کے انداز ادب کا موضوع بننے لگتے

ہیں۔اسی طرح ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مختلف تہذیبی رویوں اور سیاسی نظاموں کی آویزش وآمیزش نے جس طرح زندگی کو ہمارے ادب کا حصہ بنایا ہے اس نے ہمارے ادب میں آزادی اور حریت کے نئے دور کے احیاء کا مرحلہ سرانجام دیا ہے۔اس کے فوراً بعد سرسید اور ان کے رفقاء کی علمی وادبی تحریک نے مسلم قومیت کے تشخص اور اس کے معاشی و سیاسی مسائل کو ادب کا موضوع بنا کر قوم کو خواب غفلت سے جگانے میں اپنے حصے کا کردار ادا کیا۔اے۔بی۔اشرف نے اپنی تنقید میں بیسویں صدی کے آغاز میں ہونے والی دو عالمی جنگوں کے تناظر میں ادب کے سماجی عمل کے معاشرے پہ اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے تاریخی شعور کا اظہار کیا ہے۔ان کے مطابق:

> ''سماج کی ٹوٹ پھوٹ کا تاریخی عمل ایک بار پھر اس وقت شروع ہوا جب دو عالمی جنگوں کی بدولت اقتصادی بحران کے ساتھ ساتھ سرمایہ دارانہ نظام نے جاگیرداری نظام کی جگہ لینی شروع کر دی۔اس صنعتی اور مشینی نظام نے بھوک،افلاس،طبقاتی کشمکش،دولت کی غیر منصفانہ تقسیم اور استحصال زر کی خباثتوں کو جنم دیا۔'' ۶

دونوں عالمی جنگوں نے انسانیت کو جو کچھ دیا اے۔بی۔اشرف نے اس کا بخوبی تجزیہ کیا ہے۔دونوں عالمی جنگوں نے انسانیت پہ جو قیامتیں ڈھائیں اس کے ساتھ ساتھ لوگوں میں اور ادب میں سیاسی وسماجی بیداری کے حوالے سے ان کا کردار بڑی اہمیت کا حامل ہے۔بالخصوص ان جنگوں کے نتیجے میں جنم لینے والے استحصالی نظام کے خلاف ادب میں دو توانا آوازیں اقبال اور کرشن چندر ہمیں اس عہد کے عصری شعور کا اظہار کرتی دکھائی دیتی ہیں۔اس عہد میں ترقی پسند ادب کی تحریک نے انسانوں پہ انسانوں کے جبر اور سیاسی نظام کے باعث استحصال کی جبریت کے خلاف آواز بلند کی۔یوں ہمارے ادب میں نئے نظریات اور جدید ادبی تحریکوں کے باعث ادب کی وسعتوں میں اضافہ ہوا۔

بلا شبہ اس بات سے مفر نہیں کہ ہمارے ادیبوں نے تخلیقی اعتبار سے بہترین ادب کی پیش کش میں اپنے حصے کا کردار ادا کیا ہے۔لیکن ہمارے نقادوں نے بھی ادب کی روش اور مسائل کے حوالے سے اپنی تنقیدات میں نئی راہوں کے تعینات اور ان کی اہمیت کا احساس دلایا ہے۔عرش صدیقی نے اس حوالے سے اے۔بی۔اشرف کی تنقید کے اس خاص پہلو کو اجاگر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انھوں نے ہمیشہ سماجی ظلم کے خلاف اٹھائی ہے اور ان کی تنقید کا بنیادی نکتہ بھی یہی ہے اسی لیے وہ طبقاتی اور جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ استحصال پہ تنقید کرتے رہتے ہیں۔ ۷ اے۔بی اشرف ظلم کے خلاف آواز اٹھاتے رہے ہیں۔آپ کے نزدیک جاگیرداری اور سرمایہ دارانہ نظام ہی ہمارے ہاں مثالی معاشرے کے قیام کی راہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہیں۔آپ لکھتے ہیں:

> ''ہمارے یہاں کے جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام نے ان امکانات کو ہمیشہ معدوم کئے رکھا جو مثالی معاشرے کے قیام کا باعث بن سکتے تھے۔ہوس زر اور ہوس اقدار نے خود غرضی،نفسانفسی،استحصال اور منافقت کو جنم دیا۔آج ہمارا معاشرہ زوال کی انتہائی حدوں کو چھو رہا ہے۔رشوت،سفارش،بے ایمانی،جھوٹ،منافقت اور ہر نوع کی کرپشن اپنے عروج پر ہے۔کسی میں خلوص نہیں،قوم اور ملک کا درد نہیں،ہر طرف لوٹ مچی ہوئی ہے۔ذات پات کی تمیز،ادنیٰ اور اعلیٰ کا تصور اور

امیر غریب کا فرق عام ہے۔ رواداری، خلوص ومحبت اور مروت وشرافت کے اعلیٰ جذبے مفقود ہو چکے ہیں۔ معاشرے میں دولت کو بالادستی حاصل ہے۔ لیاقت، قابلیت، ذہانت اور شرافت کو کوئی نہیں پوچھتا۔ مارشل لاؤں، غیر جمہوری حکومتوں اور بیوروکریسی کی طاقت نے آزادی کا تصور ملیا میٹ کر کے رکھ دیا ہے۔ کوئی انسان مطمئن نہیں، جس معاشرے میں جان و مال اور عزت کا تحفظ نہ ہو، جہاں سوشل جسٹس کا نام نہ ہو، جہاں قانون اور دستور پر عمل نہ ہو اسے کس طرح اقبال کے خواب کی تعبیر قرار دیا جاسکتا ہے؟'' ۸

درج بالا پیراگراف کی روشنی میں یہ بات واضح نظر آتی ہے کہ طبقاتی، جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ استحصال ہی ہے جو ادب کی تخلیق پہ اپنے گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو تحریک پاکستان کے قبل اور مابعد کی شاعری اور افسانے میں ہمارے معاشرے کے استحصالی ہتھکنڈوں سے مملو ادب میں ہمیں انسانوں کے انسانیت پہ ظلم وستم کی دلخراش داستانیں ملتی ہیں۔ اے۔ بی۔ اشرف نے اس دور میں ہونے والی سائنسی اور مادی ترقی کے باعث درآنے والی ترقی کے انسان پہ ہونے والے ستم کو بڑی خوبصورتی سے واضح کیا ہے۔ ان کے مطابق:

''آج کے سائنسی اور تکنیکی عصر میں سماجی عمل نے ایک اور صورت اختیار کر لی ہے۔ مشینی نظام کی قوت، لامحدود صنعتی ترقی، مختلف سیاسی نظاموں کی آمرانہ روش اور منڈیوں کی تقسیم، ایک محدود طبقے کے استحصالی ہتھکنڈوں نے سماجی عمل کی نوعیت بدل کر رکھ دی ہے۔ سرمایہ داری نظام نے فسطائیت کا روپ اختیار کر لیا ہے۔ نو آزاد اور پسماندہ ملکوں کو اقتصادی غلام بنایا جا رہا ہے۔ قومی اور نسلی امتیاز، طبقاتی کشمکش، لوٹ کھسوٹ آزاد مسابقت کی وحشیانہ دوڑ، خودغرضی، زر پرستی، سیاسی ہوس، توسیع پسندی اس نظام کی دین ہے۔'' ۹

دونوں عالمی جنگوں کے بعد سرمایہ داری جس طرح سے فسطائیت کا روپ دھارتی ہے، اس کے شاخسانے میں کراہتی ہوئی انسانیت اور دم توڑتی ہوئی اخلاقی اور معاشرتی اقدار کی لہولہو زندگی ہمارے ادب میں رقم ہوتی رہی ہے۔ اے۔ بی۔ اشرف نے اس کے جبر کو بھی واضح کیا ہے اور ادب کے سماجی عمل پہ اس کے اثرات کے باعث آنے والی بربادی کا نوحہ بھی رقم کیا ہے۔ اس نوحے کے تنقیدی تیور یہ واضح کرتے ہیں کہ قوموں کو اقتصادی حوالے سے غلام بنانے کی روایت کا آغاز اسی عہد سے ہوتا ہے اور اسی عہد نے خودغرضی، زر پرستی اور سیاسی ہوس کی جو راہیں کھولی ہیں انھوں نے انسان سے اس کی آزادی چھین لی ہے۔ آنے والے کل کے انسان میں عدم تحفظ، بے روزگاری اور محکومیت کے عہد میں ناامیدی کے گہرے اثرات پیدا ہوئے۔ انیسویں صدی کے آخر پر مسلمانوں کی حالتِ زار کا نوحہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''انیسویں صدی کے نصف آخر سے مسلمانانِ عالم پر جو زوال اور انحطاط کی کیفیت شروع ہوئی تو پھر رک نہ سکی۔ یوں تو قرن ہا قرن سے ان میں بے عملی، زوال اور فرسودگی کے آثار پائے جاتے تھے، لیکن اہل فرنگ کی ہوس ملک گیری اور توسیع پسندی نے اس زوال کو تیز تر بھی کیا اور اقوام مسلم

کو اپنے استعمال و استحصال کا شکار بھی بنایا۔'' ۱۰

اسی طرح طبقاتی اور استحصالی معاشرے اور نو آبادیاتی نظام پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سلطنت کی توسیع کی ہوس نے نو آبادیاتی نظام کو جنم دیا اور یوں سرمایہ داری نظام کے استحصال کا دائرہ اور وسیع ہو گیا۔ پھر ایک نشہ تہذیب کا ہے کیونکہ تہذیب کا دائرہ مخصوص مراعات یافتہ طبقے کی تہذیب تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ طبقاتی تہذیب معاشرے میں طبقاتی ناہمواری کا باعث بن کر رہ گئی۔ ایک طرف تو سماجی روابط سے متاثر ہوئے اور دوسری طرف استحصالی اقدار وجود میں آئیں۔'' ۱۱

استحصال کنندہ اور انسان کی شکار انسانیت کی ذہنی اور فکری صورتحال کیا ہوتی ہے اور ان کی دلچسپیوں کا دائرہ کن امکانات و ممکنات کے دائرے میں بڑھتا اور گھٹتا رہتا ہے اس سب کو جب تنقیدی نگاہ سے دیکھا جائے تو جابر اقوام کی ذہنی صورتحال اس کے ادب کے حوالے سے سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔ اسی طرح استحصال کی شکار انسانیت کے ہاں روحِ انقلاب کے بیدار ہونے کے عناصر کی خبر ملتی ہے۔ یہ سب ادب کے مطالعے سے سامنے آتا ہے۔ اے۔ بی۔ اشرف نے مغرب کے ادب اور ہمارے ادب کے تعینات کا تجزیہ بڑی خوبصورتی سے کرتے ہوئے ادب کی عصریت اور اس کے تناظر میں ہمارے ادیبوں اور نقادوں کے سماجی عمل کی صورت کو بیان کیا ہے۔ اسے اے۔ بی۔ اشرف کے تنقیدی شعور کی بڑی اہم جہت قرار دیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے خود غرض عالمی سماج کے امیج کو بھی اپنی تنقید سے واضح کیا ہے۔ وہ رقم طراز ہیں:

''آج کی اس نام نہاد مہذب دنیا کے ہاتھوں فلسطینیوں اور لبنان کے بے گناہ شہریوں پر جو مظالم ڈھائے جا رہے ہیں اور جس طرح مہذب ترقی یافتہ سپر طاقتیں اور قومیں خاموش تماشائی بنی اپنی سازشوں کو پھلتا پھولتا دیکھ رہی ہیں اس سے ایک ایسے خود غرض عالمی سماج کا امیج ابھرتا ہے جو بے حس بھی ہے اور بے ضمیر بھی۔ استحصال اور تخریب کی اس بے پناہ یلغار نے انسانی ذہن کو ایک ایسے بحران کا شکار کر دیا ہے کہ زندگی کی ساری مروجہ اقدار پر سے ایمان اٹھتا جا رہا ہے۔ آج ہر فرد خود کو اس بھری پوری دنیا میں بے یار و مددگار اور تنہا محسوس کرتا ہے اور اجتماعی قدروں کو سیاسی نظاموں کا ڈھونگ تصور کر کے صرف اپنی ذات میں پناہ لینے کی کوشش کر رہا ہے۔'' ۱۲

عالمی طاقتوں کے قائم کردہ خود غرض، بے حس اور بے ضمیر عالمی سماج کے نظریے نے انسان کو خوف و ہراس اور بے یقینی کی فضا کا بے یار و مددگار فرد بنا دیا ہے۔ بے چہرگی، تنہائی، ہراس، خوف، بزدلی اور قنوطیت نے ہر سو ڈیرے ڈال دیے ہیں۔ مایوسیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتی ابھرتی انسانیت دم توڑتی اور اپنی قدروں سے خالی ہوتی جا رہی ہے۔ اس شکست اور محرومی نے انسان، ادب اور آنے والے کل پر اپنے ایسے مہیب اثرات ڈالے ہیں کہ کل کا تابناک اور روشن چہرہ نظر نہیں آ رہا۔ اے۔ بی۔ اشرف نے اس لایعنیت، بے معنویت اور اجنبیت کے پیش منظر کے ماحول میں آج کے ادیب کے فرض منصبی پہ بڑی اہم بات کی ہے۔

''آج کے ادیب کا یہ فرض ہے کہ حق کی ترجمانی کرے، ظالم کے مقابلے میں مظلوم کی حمایت

کرے۔ لایعنیت کے منطقوں میں معنویت کی راہیں سُجھائے اور یاسیت کی ظلمتوں میں امید کے سورج چمکائے کہ آج کے ادب کے سماجی عمل کا یہی تقاضا ہے۔'' ۱۳

ہم جب اس تناظر میں مجموعی طور پر اے۔ بی۔ اشرف کے تنقیدی شعور کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں ان کی ہمہ جہت تنقیدی شعور کے منظرنامے میں تاریخی شعور اور عصری شعور کا امتزاج ملتا ہے۔ وہ کسی بھی ادب پارے کے مطالعے میں اس کے عہد اور اس کے عہد کے سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی عوامل کا بغور جائزہ لیتے ہیں اور اپنے تنقیدی ماحاصلات کو پیش کرتے وقت ان کے عہد کے انسانوں کے شعور اور احساسات کو ہی مدنظر نہیں رکھتے بلکہ ان کا عصری شعور آتے جاتے زمانوں میں تخلیق کاروں کے مجموعی سیاسی، سماجی اور معاشرتی ادراکات کو بھی مدنظر رکھتا ہے اور یوں عصری شعور ان کی تنقید کی ایک بڑی خوبصورتی بن کر صفحہ بہ صفحہ جلوہ گر دکھائی دیتی ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ عرش صدیقی، ڈاکٹر، محاکمات، لاہور، سارنگ پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء، ص ۳۷۲

۲۔ اشرف، اے۔ بی، ڈاکٹر، مسائلِ ادب، تحقیق و تجزیہ، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، ص ۱۵

۳۔ ایضاً، ص ۱۸، ۱۹

۴۔ ایضاً، ص ۲۲

۵۔ ایضاً، ص ۲۴

۶۔ ایضاً، ص ۲۹

۷۔ عرش صدیقی، ڈاکٹر، محاکمات، ص ۳۳۷

۸۔ اشرف، اے۔ بی، ڈاکٹر، شاعروں اور افسانہ نگاروں کا مطالعہ، لاہور، سنگ میل پبلیکیشنز، ۲۰۰۹ء، ص ۱۰۲، ۱۰۳

۹۔ اشرف، اے۔ بی، ڈاکٹر، مسائل ادب، تحقیق و تجزیہ، ص ۳۵

۱۰۔ اشرف، اے۔ بی، ڈاکٹر، شاعروں اور افسانہ نگاروں کا مطالعہ، ص ۸۷

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۱۰

۱۲۔ اشرف، اے۔ بی، ڈاکٹر، مسائل ادب۔ تحقیق و تجزیہ، ص ۳۱

۱۳۔ ایضاً، ص ۳۲